بحث و نظر

"ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل"

حافظ عاطف وحید کے پیش کردہ اشکالات کے جواب میں
مولانا محمد طاسین صاحب کی مفصل وضاحت

گرامی قدر محترم مدیر ماہنامہ حکمت قرآن

السلام علیکم ورحمتہ اللہ! مزاج گرامی!

© rasailojaraid.com

ماہنامہ حکمت قرآن کا شمارہ اگست ۹۶ء ملا' اس کے اداریئے میں آپ نے از راہ حسن ظن میرے متعلق جو لکھا ہے اس پر شکر گزار ہوں۔ یہ آپ کے اخلاق عالیہ کا نتیجہ ہے ورنہ میں کچھ نہیں۔ نیز آپ نے یہ جو تحریر فرمایا ہے کہ میری اس تحریر کے متعلق جو حکمت قرآن کے شمارہ جون ۹۶ء میں ایک سوال کے جواب میں شائع ہوئی تھی بعض اہل علم نے اپنی تحریروں میں اختلاف کا اظہار کیا اور بغرض اشاعت آپ کو بھیجی ہیں جن میں سے ایک اس شمارے میں شائع کی گئی ہے' پڑھ کر ناخوشی کی بجائے خوشی ہوئی' کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے علمی مناقشوں سے بعض دفعہ زیر بحث مسئلہ کے متعلق کچھ نئے امور سامنے آجاتے ہیں اور پڑھنے والوں کو فائدہ پہنچتا ہے' بشرطیکہ علمی بحث و مباحثے کا مقصد تحقیق حق اور ابطال باطل ہو' کسی کو نیچا دکھانا اور بدنام کرنا نہ ہو۔

سب جانتے ہیں کہ کاغذی کرنسی یعنی نوٹوں کے قرض کا معاملہ ان معاملات میں سے ایک ہے جو ظہور اسلام اور نزول قرآن کے وقت عرب معاشرے میں موجود نہ تھے' اس لئے کہ اس وقت دنیا میں کہیں بھی کاغذی کرنسی کا وجود نہ تھا' لہٰذا قرآن و حدیث میں صراحت کے ساتھ اس کی شرعی حیثیت کا ذکر نہ ہونا قابل فہم اور قرین عقل ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے یہ مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے کہ کرنسی نوٹوں کے قرض کی شرعی حیثیت کیا

© rasailojaraid.com

ہے؟ اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے مسئلہ کی شرعی حیثیت متعین کرنے کے لئے جو علمی طریقہ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق جو اصول و مبادی ہیں ان کی روشنی میں اس نئے مسئلہ کا گہرا اور تحقیقی جائزہ لینے کی آخری حد تک جہد و کوشش کی جائے اور پورے غور و فکر سے یہ دیکھا جائے کہ اس معاملہ کی جائز صورت کیا ہے اور ناجائز صورت کیا؟ اور پھر ایسی کوشش و جہد کرنے والا اپنے علم و فہم کے حوالہ سے اس کو بیان کرے۔ عین ممکن ہے دو مختلف علم و فہم رکھنے والے ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو مختلف آراء تک پہنچیں اور ان کا بیان کردہ شرعی حکم متضاد ہو' ایک جواز کا قائل ہو اور دوسرا عدم جواز کا۔ پھر چونکہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مجتہد مصیب بھی ہوتا ہے اور مخطی بھی' یعنی اس کی قائم کردہ رائے صحیح و صائب بھی ہو سکتی ہے اور غلط و خاطی بھی' لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی اجتہادی رائے کو قطعی طور پر صحیح اور دوسرے کی رائے کو قطعی و حتمی طور پر غلط کہے۔ اور اگر وہ مسئلہ ایسا ہے جو حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اور حلال و حرام کے زمرہ میں آتا ہے تو ایک عہد کے اجتہادی صلاحیت رکھنے والے علماء کرام کی یہ منصبی ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ وہ ایک جگہ مل جل کر بیٹھیں اور اجتماعی غور و فکر سے ایسے مسئلہ کو حل کرنے کی انتہائی کوشش کریں۔ ایک طرف اس مسئلہ کی نفس الامری حقیقت کو پوری توجہ کے ساتھ سمجھنے اور متعین کرنے کی کوشش کریں کیونکہ بعض دفعہ زیر بحث مسئلے کا صحیح ادراک نہ ہونا بھی موجب اختلاف بن جاتا ہے' دوسری طرف ایک دوسرے کے دلائل کو اپنے دلائل سمجھ کر ان کی صحت و عدم صحت کا جائزہ لیں' مقصد اختلاف کو ختم کرنا اور ایک متفقہ رائے تک پہنچنا ہو تا کہ پورے وثوق اور اطمینان کے ساتھ اس پر عمل ہو سکے۔

زیر بحث مسئلہ بھی چونکہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اور حلال و حرام کے ذیل میں آتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ مذکورہ علمی طریقہ سے اس کو حل کرنے کی کوشش عمل میں لائی جائے۔ واضح رہے کہ اب تک اس مسئلہ کے حل کے متعلق جو انفرادی اور اجتماعی علمی کوششیں ہوئیں اور سامنے آئی ہیں ان میں خاصا اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

ہے۔ بعض کے نزدیک کرنسی نوٹوں کی حیثیت مال حقیقی کی ہے لہٰذا قرض کے معاملہ میں ان کی واپسی اسی تعداد کے مطابق ہونی چاہیے جس تعداد میں وہ بوقت قرض لئے دیئے گئے تھے جبکہ دوسرے بعض کے نزدیک کرنسی نوٹوں کی حیثیت حقیقی مال کی نہیں بلکہ حکمی اور اعتباری مال کی ہے لہٰذا قرض کے معاملہ میں ان کی واپسی ان کی تعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ حقیقی مال یعنی سونے کی مقدار کے اعتبار سے ہونی چاہیے، خواہ واپسی کے نوٹوں کی تعداد اصل لئے گئے نوٹوں کی تعداد سے کم یا زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ زیر بحث مسئلہ سے متعلق میری وہ مختصر تحریر جو ایک نجی خط کے جواب میں لکھی گئی اور ماہنامہ حکمت قرآن (جون ۹۶ء) میں شائع ہوئی چونکہ دوسرے یعنی ثانی الذکر عندیئے سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا اول الذکر عندیہ رکھنے والے اہل علم حضرات کا اس سے اختلاف کرنا ایک تقاضا ہے۔

© rasailojaraid.

بہرحال حکمت قرآن کے تازہ شمارے میں میری مذکورہ تحریر پر جو تنقیدی مضمون شائع ہوا ہے اور اس کے اندر محترم مضمون نگار نے کچھ نکات اٹھائے اور ان کی مزید تشریح و تفہیم کو ضروری قرار دیتے ہوئے ان پر جو نکتہ وار بحث فرمائی ہے اس کے شروع میں موصوف نے بحث کے لئے میری تحریر کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے جو اس طرح ہے :

"کرنسی نوٹوں میں مثل کا مطلب ہے قوت خرید میں برابری جو مذکورہ صورت میں نہیں ہو سکتی کیونکہ آج کے کرنسی نوٹ قوت خرید میں ان نوٹوں کی قوت خرید کے برابر نہیں ہو سکتے جو مثلاً پانچ سال پہلے قرض کے طور پر لئے دیئے گئے تھے، لہٰذا کرنسی نوٹوں کے قرض میں اگر یہ ضروری ٹھہرایا جائے کہ جتنی تعداد میں وہ قرض لئے گئے تھے ٹھیک اتنی ہی تعداد میں بوقت ادائیگی واپس کئے جائیں تو اس صورت میں قرض دینے والے فریق کو نقصان پہنچتا اور اس کی لازماً حق تلفی ہوتی ہے، چنانچہ اس وجہ سے بھی معاملہ مذکورہ ظلم و حق تلفی کی بنا پر باطل و ناجائز قرار پاتا ہے۔"

اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد محترم مضمون نگار نے بطور تنقید اس پر جو لکھا ہے اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ قارئین ماہنامہ حکمت قرآن میں

© rasailojaraid.

سے جو حضرات اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے اور اس کی شرعی حقیقت کو جاننا چاہتے ہوں وہ ایک مرتبہ پھر حکمت قرآن میں شائع شدہ میری تحریر کو ضرور ملاحظہ فرمائیں کیونکہ اوپر منقولہ عبارت کا صحیح مطلب اچھی طرح اس وقت واضح ہو سکتا ہے جب اس سے پہلے اور بعد کی عبارت بھی سامنے ہو جو باہم مربوط ہے۔ آپ میری پوری تحریر ملاحظہ فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ میں نے شروع میں یہ واضح کیا ہے کہ "میرے علم و فہم اور غور و فکر کے مطابق اس مسئلے کا جو حل اور اس سوال کا جو جواب ہے اس کو پیش کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ دو اصولی باتیں عرض کر دوں جن سے میرے حل اور جواب کا گہرا تعلق ہے۔" اس کے بعد میں نے وہ دو اصولی باتیں واضح الفاظ میں بیان کی ہیں جو دلیل کے صغریٰ کبریٰ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بعد جو لکھا ہے وہ ان ہی دو اصولی باتوں پر مبنی اور گویا ان کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا میرے جواب کو غلط ثابت کرنے کا صحیح علمی طریقہ یہ ہے کہ ان دو اصولی باتوں کو جو دلیل کے مقدمات کے طور پر ہیں شرعی اور عقلی دلائل سے غلط ثابت کیا جائے۔ چنانچہ اگر وہ دونوں یا دو میں سے ایک غلط ثابت ہو جائے تو میرا جواب خود بخود غلط قرار پائے گا۔ جواب میں ذکر کردہ بعض تائیدی قسم کے امور اگر غلط ثابت ہو بھی جائیں تو اس سے نفس جواب کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جواب کی صحت و عدم صحت کا دارومدار مذکورہ دو مقدمات کی صحت و عدم صحت پر ہے چنانچہ اگر وہ مقدمات صحیح تسلیم کر لئے جائیں تو ان پر مبنی جواب کو صحیح ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔

اب میں قدرے اختصار کے ساتھ اس نکتہ وار بحث پر کچھ تبصرہ کرنا چاہتا ہوں جو موصوف نے میری تحریر کا ایک ٹکڑا نقل کرنے کے بعد بطور تنقید فرمائی ہے۔ انہوں نے یہ جو لکھا ہے کہ ربا کے معاملے میں ظلم و حق تلفی کے اعتبار سے سورۃ البقرۃ کی آیات نمبر ۲۷۸ اور ۲۷۹ اہم ترین ہیں' بالکل درست ہے۔ اسی طرح آیت نمبر ۲۷۹ کا جو ترجمہ لکھا ہے وہ بھی حرف بحرف درست اور صحیح ہے' البتہ اس کے بعد انہوں نے یہ جو تحریر فرمایا ہے کہ "مولانا کا یہ کہنا کہ ظلم سے اجتناب کا یہ تقاضا ہے کہ قرض خواہ کو اس کا مال اپنی اصل قدر اور حشل کے مطابق واپس ملنا چاہئے نہ کہ اصل مقدار کے مطابق' اس آیت کے حوالے سے محل نظر ہے۔ کم از کم دو اسباب کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیت مذکورہ

© rasailojaraid

سیاق و سباق کے اعتبار سے مولانا کی رائے سے متعارض ہے" کسی طرح درست نہیں بلکہ بوجوہ غلط ہے۔ کیونکہ میں نے جو لکھا ہے وہ معاملہ قرض کی اس شرعی تعریف کے بھی عین مطابق ہے جو کتب فقہ وغیرہ میں مذکور ہے' نیز اس قرآنی آیت کے بھی عین مطابق ہے جس کا موصوف نے حوالہ دیا اور ترجمہ پیش کیا ہے' کسی طرح اس سے متعارض نہیں۔ قرض کی شرعی تعریف کے مطابق یہ لازمی ہے کہ مقروض معاملہ قرض ختم ہونے پر مقرض کو لئے ہوئے مال کی مثل ادا کرے جو مالیت میں اس مال کے برابر ہو۔ مذکورہ قرآنی آیت میں بھی یہی ہدایت و تعلیم ہے کہ سودی قرض کا لین دین کرنے والے جب تائب ہو کر اس کو ختم کریں تو اس صورت میں قرض خواہ کا حق صرف اس کا اصل مال ہے جو اس نے مقروض کو دیا تھا' اس سے زائد کچھ نہیں اور مقروض کی ذمہ داری ہے کہ وہ قرض خواہ کو اصل مال کی مثل واپس کرے' یعنی جس تعداد اور مقدار میں اس نے مال لیا تھا اسی تعداد و مقدار میں واپس کرے۔ مثلاً ایک ہزار درہم یا دینار میں کوئی چیز خریدی تھی تو ٹھیک ایک ہزار درہم یا دینار ادا کرے۔ اسی طرح یہ ظاہر ہے کہ آیت مذکور میں رؤوس اموال سے مراد حقیقی اموال ہیں جو اس وقت دراہم و دنانیر کی شکل میں موجود تھے۔ کاغذی کرنسی اور نوٹوں کا اس وقت دنیا میں کہیں وجود نہ تھا جو حکمی اور اعتباری مال کہلاتے ہیں اور اپنی ذات' مقصد وجود اور غرض و غایت کے لحاظ سے حقیقی مال سے مختلف ہیں' لہٰذا آیت میں مذکور رؤوس اموال میں وہ شامل نہیں' چنانچہ قرض کی صورت میں ان کی واپسی کا حکم ہر حال میں وہ نہیں جو مال حقیقی کا ہے۔ بعض حالات میں جب افراط زر اور انفلیشن کی وجہ سے نوٹوں کی قوت خرید کم ہو گئی ہو تو قرض کی صورت میں ان کی ادائیگی کی تعداد زیادہ ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ حقیقی مال یعنی سونے کے معیار کے مطابق ہو۔

اس تبصرے میں جو بات میں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میں نے اپنی پوری تحریر میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ قرض خواہ کو اس کا مال اپنی اصل قدر اور مثل کے مطابق ملنا چاہئے نہ کہ اصل مقدار کے مطابق۔ یہ جو "نہ کہ اصل مقدار کے مطابق" کے الفاظ ہیں میری پوری تحریر میں کہیں موجود نہیں بلکہ اس کے برخلاف میری تحریر میں صاف مذکور ہے کہ قرض کے معاملہ میں حقیقی مال کی واپسی میں ضروری ہے کہ وہ مقدار و تعداد کے

© rasailojaraid
© rasailojaraid

لحاظ سے اصل مال کے برابر ہو' تو پھر میری بات مذکورہ آیت سے کیسے متعارض ہو سکتی ہے؟ دوسری خاص بات یہ کہ میری تحریر جس مسئلہ سے متعلق ہے وہ مال حکمی کے قرض حسن کا مسئلہ ہے نہ کہ مال حقیقی کے سودی قرضے کا مسئلہ جس کا آیت مذکور میں بیان ہے' لہٰذا اس وجہ سے بھی میری کسی بات کا آیت مذکور سے کوئی تعارض نہیں۔ اور پھر موصوف نے تعارض ثابت کرنے کے لئے جو دو اسباب بیان فرمائے ہیں ان میں سے کوئی سبب بھی علمی طور پر صحیح نہیں۔ پہلا سبب اس لئے غلط ہے کہ تفسیر نصوص قرآن مجید کے متعلق یہ ایک اہم اور بنیادی اصول ہے کہ اس میں نص کے مخصوص مورد کا اعتبار نہیں ہوتا' عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ یعنی نص کا صحیح مفہوم و مطلب وہ ہوتا ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے' وہ نہیں ہوتا جو شان نزول کی روایات کی بنا پر بنتا ہے۔ بالفاظ دیگر کسی نص قرآنی کے سیاق و سباق میں جس واقعہ کا ذکر ہوتا ہے یا شان نزول کی کسی روایت میں جس واقعہ کا بیان ہوتا ہے وہ واقعہ دراصل نص کے الفاظ سے پیدا شدہ اصل کلی کی بے شمار جزئیات میں سے ایک جزئی ہوتا ہے' لہٰذا اس واقعہ کی بنا پر نص کے عمومی اور کلی مفہوم و مطلب کو محدود اور مقید کرنا درست نہیں ہوتا۔ مثلاً زیر بحث آیت نمبر ۲۷۹ میں "لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ" کے جو الفاظ ہیں وہ ایک اصل کلی پر دلالت کرتے ہیں اور وہ یہ کہ معاشی معاملات میں کسی فریق معاملہ کی حق تلفی نہ ہونی چاہئے اور ہر ایک کو اس کا حق پورا پورا اور ٹھیک ملنا چاہئے جس کا نام عدل ہے' اور جو اسلام کے نزدیک معاملات کی صحت میں بنیاد اور شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس آیت کو ایسے حالات سے مختص کر دینا جہاں سودی معاملہ ختم کر دینے کے بعد باقی حساب چکانے میں فریقین کے درمیان نزاع جھگڑے کا اندیشہ ہو آیت کے عمومی مفہوم و مطلب میں ایک طرح کی تحریف ہے جو کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں اللہ کا کلام ہے جس کا مفہوم و مطلب متعین کرنے میں انتہائی احتیاط ہونی چاہئے۔

بہرحال اس اصول کے تحت کہ نصوص کی تفسیر میں خصوص مورد کا اعتبار نہیں ہوتا عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے' آیت "لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ" کا جو وسیع' جامع اور کلی مفہوم و مطلب قرار پاتا ہے اس کے تحت لین دین کے تمام معاشی معاملات آجاتے ہیں

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

جس طرح اس کے تحت سودی قرض کا معاملہ آتا ہے اسی طرح غیر سودی قرضہ حسنہ کا معاملہ بھی آتا ہے۔ نیز جس طرح مال حقیقی کے قرض کا معاملہ آتا ہے اسی طرح مال حکمی کے قرض کا معاملہ بھی آتا ہے۔ سب کے متعلق آیت مذکورہ میں حکم الٰہی ہے کہ ان کے طے کرنے میں اس چیز کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے کہ کسی فریق کی کوئی حق تلفی واقع نہ ہو اور ہر ایک کو اس کا حق پورا پورا ملے۔ اب دیکھئے کہ نوٹوں کے قرض کے معاملہ کے متعلق میں نے جو لکھا ہے وہ اس آیت کے مطابق ہے یا اس کے خلاف اور متعارض ہے۔ دراصل یہاں لفظ تعارض کا اطلاق ہی غلط ہے۔

تعارض کے پہلے سبب کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اب تعارض کے دوسرے سبب کی طرف آیئے جو صفحہ ۳۷ پر تحریر فرمایا گیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں : "آیت مذکورہ سے مولانا کی رائے کے متعارض ہونے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ قرض پر لئے گئے اور واپس کئے جانے والے مال یا کرنسی کا مکمل ہم قدر یا ہم مثل ہونا ممکن ہی نہیں۔" محقق موصوف سے کوئی یہ پوچھے کہ جب قرض پر لئے گئے اور واپس کئے جانے والے مال یا کرنسی کا مکمل ہم قدر یا ہم مثل ہونا ممکن ہی نہیں تو پھر کیا اس کا لازمی طور پر یہ مطلب نہ ہوگا کہ قرض کی جو مسلمہ شرعی تعریف ہے اور جس کے مطابق قرض لینے والے پر لازم ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ بوقت واپسی لئے ہوئے مال کی مثل واپس کرے' یہ سب غلط ہے' کیونکہ جب مثل ممکن ہی نہیں تو اس کے مطابق واپسی کے کیا معنے ؟

عبارت مذکور کے بعد موصوف نے مثل کے ناممکن ہونے کا جو فلسفہ بیان فرمایا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے جسے پڑھ کر تعجب اور افسوس ہوا۔ لکھتے ہیں : "اس لئے کہ افراط زر کے علاوہ بہت سے دوسرے اسباب بھی ہیں جو کرنسی کی قدر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح کئی قسم کے اخراجات ایسے بھی ہوتے ہیں جو قرض خواہ کو معاملہ قرض کی صورت میں اٹھانا پڑتے ہیں' مثلاً قرض کی واپسی کے لئے جتنے جتن قرض خواہ کو کرنے پڑتے ہیں ان سے ہر وہ شخص واقف جسے اس کا کبھی تجربہ ہوا ہو' ان میں مقروض کو یاد دہانی کے خط پتر یا ٹیلی فون کے خرچے' مقروض کے پیچھے قرض کی وصولی کے لئے ایک یا متعدد چکر اور ٹیکسی رکشہ کا کرایہ وغیرہ' مقروض کے عسر کے پیش نظر قرض کی واپسی میں

© rasailojaraid

تاخیر' یا قرض کی رقم کے مکمل ڈوب جانے کا اندیشہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سب کے لئے قیمتی وقت کا ضیاع اور اس پر مستزاد کوفت کا سامنا ہے۔ یہ ایسے ممکنہ یا واقعی خرچے ہیں جنہیں قرض خواہ کو بہرحال برداشت کرنا پڑتا ہے اور ان کے سبب سے دیئے گئے پیسے کی حقیقی قدر میں فرق پیدا ہونا لازمی ہے"۔

اس نقل کردہ عبارت پر بطور تبصرہ عرض ہے کہ اس عبارت کے شروع میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ افراط زر کے علاوہ بہت سے دوسرے اسباب ہیں جو کرنسی کی قدر پر اثر انداز ہوتے ہیں' اگر اس عبارت میں کرنسی سے ان کی مراد مطلق کرنسی ہے' خواہ وہ سونے چاندی کے دینار و درہم کی شکل میں ہو یا کاغذی نوٹوں کی شکل میں' تو ظاہر ہے کہ دراہم و دنانیر کی شکل میں جو کرنسی ہوتی ہے اس کی قدر پر کوئی سبب اثر انداز نہیں ہوتا' صرف کاغذی کرنسی افراط زر سے متاثر ہوتی ہے' خواہ وہ کسی کو قرض پر دی گئی ہو یا مالک کے اپنے پاس محفوظ ہو۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ موصوف وہ دوسرے اسباب بتلا دیتے جو مطلق کاغذی کرنسی کی قدر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر جب افراط زر کے سوا دوسرا کوئی سبب ہے ہی نہیں تو کہاں سے اور کیسے بتلاتے۔ موصوف نے اگلی عبارت میں قرض وصول کرنے کے لئے قرض خواہ کے جن اخراجات اور خرچوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے ان کا قرض میں دی ہوئی کاغذی کرنسی کی قدر پر ہرگز کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ ان کا معاملۂ قرض کی حقیقت سے کچھ تعلق ہے بلکہ یہ معاملہ قرض سے الگ ایک ایسی چیز ہے جو بعض افراد سے تعلق رکھتی ہے جو کسی صحیح اسلامی معاشرے میں ہو ہی نہیں سکتے' یا ہوں تو ایک دو فیصد ہو سکتے ہیں۔ قرض وغیرہ معاشی معاملات کے متعلق اسلامی احکام ان ایمان والے مسلمانوں کے لئے ہیں جو صداقت شعار' دیانتدار' پابند عہد و پیمان اور انصاف پسند ہوتے ہیں' جو پہلے تو کسی سے قرض لیتے ہی نہیں اور کبھی کسی اشد حاجت کے تحت لیتے ہیں تو جب تک ادا نہ ہو جائے بے چین رہتے ہیں' حسب وعدہ مقررہ وقت پر واپسی کی کوشش کرتے اور جذبہ احسان مندی کے ساتھ قرض خواہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ایک صحیح اسلامی معاشرے کی عظیم اکثریت ایسے ہی اوصاف کی حامل ہوتی ہے اور شرعی احکام و قوانین کی وضع میں اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ سچے مسلمانوں کے اندر ایسے افراد اکا دکا اور

© rasailojaraid.com

شاذو نادر ہی ہوتے ہیں جن کا مذکورہ بالا عبارت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر اس عبارت کے آخر میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ : "یہ ایسے ممکنہ یا واقعی خرچے ہیں جنہیں قرض خواہ کو بہر حال برداشت کرنا پڑتا ہے اور ان کے سبب سے دیئے گئے پیسے کی حقیقی قدر میں فرق پیدا ہونا لازمی ہے" یہ ایک ایسی بات ہے جو عام قرض خواہوں کے حوالہ سے خلاف واقعہ اور غلط ہے۔ ہمارے موجودہ پاکستانی معاشرے میں بھی جس کو کرپشن کے لحاظ سے نمبر دو پر بتلایا جاتا ہے بے شمار ایسے قرض خواہ پائے جاتے اور مل سکتے ہیں جن کو قرض وصول کرنے میں کبھی مذکورہ قسم کے اخراجات برداشت نہیں کرنے پڑتے اور نہ ٹیکسیوں اور رکشوں پر چکر لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے' للذا بطور قرض دیئے ہوئے ان کے پیسے کی حقیقی قدر میں کچھ فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جتنی تعداد اور مقدار میں وہ بطور قرض کسی کو مال دیتے ہیں اتنی ہی تعداد اور مقدار میں وہ ان کو مثل کے طور پر واپس مل جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں قرض حسن لینے دینے کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔

پھر اس سے آگے حافظ صاحب موصوف نے یہ جو لکھا ہے کہ "مزید برآں کوئی ایسا انڈکس واشاریہ بنانا بھی ممکن نہیں جو مختلف اشیاء کی قیمتوں میں تبدیلی اور اوپر مذکورہ اخراجات کی اس طور سے اکٹھی پیمائش کرے کہ کرنسی کی قدر میں تبدیلی کو قطعی طور متعین کر سکے۔" اس عبارت کا میرے زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ افراط زر کی وجہ سے جب نوٹوں کی قوت خرید میں کمی واقع ہو جائے تو تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافہ کرنے کا کیا طریقہ اور کیا فارمولا ہونا چاہئے۔ میری شائع شدہ تحریر صرف معاملہ قرض کی اس شکل سے متعلق ہے جس میں قرض کا لین دین نوٹوں کے ذریعے ہوا ہو اور افراط زر کی وجہ سے ادائیگی کے وقت نوٹوں کی قوت خرید کم ہو گئی ہو۔ میں نے اس کے متعلق کسی انڈکس کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ یہ لکھا ہے کہ نوٹوں کے قرض کے معاملہ میں سونے کو معیار بنایا جائے جو حقیقی مال ہے اور اس کے مطابق ادائیگی عمل میں لائی جائے۔ اس طریقہ سے کسی فریق کی کوئی حق تلفی واقع نہیں ہوتی اور معاملہ عدل کے مطابق طے پاتا ہے جیسا کہ اسلام کا منشاء ہے۔

اس کے بعد تنقید نگار نے جو لکھا ہے اس کو راسخ علم اور عمیق فہم رکھنے والا کوئی

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

شخص ہرگز نہیں لکھ سکتا۔ اس عبارت میں بطور تنقید جو بات تحریر فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا کا یہ لکھنا کہ قرض میں مثل کا لوٹانا ضروری ہے قرآن مجید کی آیت : وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ کے خلاف ہے' کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آیت اس طرح ہوتی : فَلَكُمْ مِثْلُ رُءُوسِ أَمْوَالِكُمْ 'اور چونکہ اس میں مثل کا لفظ مذکور نہیں لہٰذا قرض میں مثل کا لوٹانا ضروری نہیں----- میرے نزدیک اس قسم کی جاہلانہ غیر علمی بات کا نوٹس لینا اور اس کا جواب لکھنا تضیع اوقات ہے' لیکن کیا کیا جائے بعض دفعہ دوسروں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے۔

جواب میں پہلی بات جو میں تکرار کے ساتھ کہہ چکا ہوں وہ یہ ہے کہ معاملہ قرض کی شرعی تعریف جس پر ہمیشہ فقہاء و علماء کا اتفاق رہا ہے اس کے مطابق مقروض پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ بوقت ادائیگی لیے ہوئے مال کی مثل ادا کرے۔ لہٰذا میں نے جو لکھا ہے' قرض کی مسلمہ تعریف کی بنا پر لکھا ہے یہ میری کوئی طبع ساز بات نہیں جو میں نے اپنے پاس سے گھڑلی ہو۔ دوسری بات جواب میں یہ کہ قرض کی ادائیگی میں مثل کی جو قید ہے وہ آیت مذکور کے خلاف نہیں بلکہ عین مطابق ہے۔ وہ اس طرح کہ اس آیت میں سودی قرض کا کاروبار کرنے والوں کو مخاطب کرکے یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تم تائب ہو کر اس سے باز آ جاؤ تو پھر تمہارے لئے صرف تمہارے رؤس اموال ہیں جو تم نے بطور قرض دوسروں کو دیئے تھے۔ یعنی قرض لینے والوں پر لازم ہے کہ وہ قرض دینے والوں کو ان کے رؤس اموال ادا کریں۔ اور یہ ظاہر اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ان رؤس اموال سے مراد بعینہ وہ اموال نہیں ہو سکتے جو خاص دراہم و دنانیر وغیرہ کی شکل میں قرض لینے والوں کو دیئے گئے تھے کیونکہ وہ تو قرض لینے والوں نے خرید و فروخت وغیرہ میں خرچ کر دیئے اور ان کے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ قرض کا مال بعینہ کسی کے پاس محفوظ نہیں رہتا جس طرح امانت کا مال بعینہ امانتدار کے پاس محفوظ رہتا ہے تو پھر رؤس اموال سے مراد ظاہر ہے کہ ان کی مانند اور مثل اموال ہی ہو سکتے' ہیں یعنی دیئے لئے ہوئے دراہم و دنانیر کے بدلے ان کی مثل دوسرے دراہم و دنانیر۔ تو گویا آیت مذکور کا مطلب ہوا رؤس اموال کی مثل اموال' جو بغیر کسی تاویل کے ہر اس شخص کی سمجھ میں

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

آ سکتا ہے جو کچھ بھی عقل و فہم رکھتا ہو۔ اس کے باوجود اگر رؤس اموال سے پہلے "مثل" کا لفظ ہوتا تو وہ بلاغت کے خلاف اور فضول ہوتا' بالفاظ دیگر جب آیت مذکور میں بعینہٖ ہونے کا احتمال ہی موجود نہیں تو پھر مثل کا ہونا یقینی طور پر متعین ہو جاتا ہے۔ پھر اگر رؤس اموال کا لین دین گن کر تعداد کے حساب سے ہوتا ہو تو مثل سے مراد تعداد میں برابر اور اگر ماپ تول کے حساب سے ہوتا ہو تو مثل سے مراد ماپ تول کی مقدار میں مساوات قرار پاتا ہے۔

اس کے بعد صفحہ نمبر ۴۸ پر دوسرے پیراگراف میں بھرتی کے طور پر جو لکھا ہے وہ بے محل بھی ہے اور غلط بھی' کیونکہ اس میں مال حقیقی کا مصداق صرف سونے چاندی کو قرار دیا گیا ہے جبکہ مال حقیقی کا مصداق وہ تمام اشیاء ہیں جن کی ذات کے اندر انسان کی طبعی و جبلی حاجت کو پورا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہو اور ان کی خرید و فروخت کی جاتی ہو۔ کھانے پینے کی غذائی اشیاء' پہننے پوشنے کے کپڑے' رہنے سہنے کے مکان اور فرنیچر' آسائش و زیبائش کے سامان وغیرہ سب مال کی تعریف میں آتے اور اس کا مصداق ہیں۔ سونے چاندی کے سکے مال ہونے کے ساتھ ساتھ ثمنیت کی صفت بھی رکھتے ہیں کہ ان کے ذریعے باقی اموال کی خرید و فروخت عمل میں آتی ہے۔ البتہ کاغذی کرنسی یعنی نوٹ مال حقیقی کی تعریف میں نہیں آتے کیونکہ ان کی ذات کے اندر انسان کی کسی طبعی و جبلی حاجت کو پورا کر سکنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ وہ کاغذ کا ٹکڑا ہونے کی حیثیت سے اپنی ذات میں وہ ثمنیت نہیں رکھتے جو دراہم و دنانیر یعنی چاندی سونے کے سکوں میں موجود ہوتی ہے۔ حکومت کی منسوخی کے بعد بھی سونے چاندی کے سکوں میں مالیت موجود رہتی ہے جبکہ نوٹوں میں وہ باقی نہیں رہتی۔ پیراگراف مذکور میں چونکہ مال حقیقی کو سونے چاندی تک محدود بتلایا گیا ہے لہٰذا غلط ہے اور چونکہ میرے زیر بحث مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں لہٰذا بے محل ہے۔

آگے اسی صفحہ کے آخری پیراگراف میں یہ جو لکھا گیا ہے "مزید برآں اس دور میں درہم و دینار کی بطور کرنسی وہی حیثیت تھی جو آج کرنسی نوٹ کی ہے' ان سے اشیاء کے لین دین' اشیاء کی قدر کی پیمائش اور قدر کے تحفظ کی اسی طریقے سے حاجت پوری کی

© rasailojaraid.com

جاتی تھی جس طرح روپے پیسے سے آج کی جاتی ہے۔" اس پر میرا تبصرہ یہ ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ عبارت مذکور میں جن پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے لحاظ سے پہلے زمانہ کے دراہم و دنانیر یعنی سونے چاندی کے سکوں اور موجودہ دور کے کرنسی نوٹوں میں پوری مماثلت ہے لیکن کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن کے اعتبار سے ان دونوں کے درمیان مغائرت بھی پائی جاتی ہے جس کا بعض معاملات میں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً ایک اس پہلو سے مغائرت پائی جاتی ہے کہ دراہم و دنانیر یعنی سونے چاندی کے کرنسی سکوں کی ذات میں 'قطع نظر ان کے کرنسی ہونے کے بھی' مالیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کی کرنسی کی حیثیت ختم ہو جانے کے بعد بھی دوسرے حقیقی اموال اور اشیاء ضرورت سے ان کا تبادلہ کیا جاتا ہے جبکہ کاغذی نوٹوں کی ذات میں' قطع نظر ان کے کرنسی ہونے کے' کوئی مالیت موجود نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ کینسل شدہ نوٹوں کے عوض کوئی حقیقی مال نہیں مل سکتا کیونکہ اب وہ کاغذ کے بیکار ٹکڑے ہوتے ہیں۔ دوسرا پہلو ان دونوں کے مابین فرق و مغائرت کا یہ ہے کہ افراط زر کی وجہ سے سونے چاندی کے کرنسی سکوں کی مالیت اور قوت خرید میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی جب کہ ان کے بالمقابل کرنسی نوٹوں کی قوت خرید میں افراط زر کی وجہ سے ضرور کمی واقع ہوتی ہے جو آج ایک کھلی ہوئی ناقابل انکار حقیقت ہے۔ یہاں یہ اچھی طرح ذہن نشین رہے کہ سونے چاندی کے سکوں یعنی دراہم و دنانیر کے عوض بعض دفعہ اشیاء ضرورت کم مقدار میں ملنا اور بعض دفعہ زیادہ مقدار میں حاصل ہونا' افراط زر کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ طلب و رسد کے مسلّمہ اصول کے تحت ہوتا ہے۔ جب کوئی شے بازار میں زیادہ آجاتی اور اس کی طلب اور مانگ کم ہوتی تو اس کا نرخ گھٹ جاتا ہے اور کم داموں میں ملتی ہے۔ اس کے برعکس جب منڈی میں کسی چیز کی رسد کم اور طلب زیادہ ہوتی ہے تو اس کا بھاؤ بڑھ جاتا ہے اور زیادہ داموں میں ملتی ہے۔ خود بحیثیت جنس کے سونے چاندی کا بھی یہی حال ہے۔ عالمی منڈی میں اس کی قیمت کا اتار چڑھاؤ طلب و رسد کے تناسب سے ہوتا ہے اور دوسری اشیاء سے اس کے تبادلے کی قدر میں کمی بیشی واقع ہوتی ہے۔

بہرحال سونے چاندی کے کرنسی سکوں اور کاغذی کرنسی کے نوٹوں میں مذکورہ دو

© rasailojaraid.c
©rasailojaraid.c

پہلوؤں سے جو فرق ہے اس فرق کی وجہ سے بعض صورتوں میں ان کے قرض کا معاملہ ایک دوسرے سے شرعی حکم میں مختلف ہو جاتا ہے۔ سونے چاندی کے سکوں کے قرض میں ضروری ہوتا ہے کہ ان کی ادائیگی ٹھیک اس تعداد کے برابر اور مثل ہو جتنی تعداد میں وہ لئے دیئے گئے تھے، بخلاف کرنسی نوٹوں کے کہ ان کے قرض میں یہ ضروری نہیں کہ ہر حال میں اسی تعداد میں واپس کئے جائیں جس تعداد میں وہ لئے دیئے گئے تھے۔ بالفاظِ دیگر مطلب یہ کہ اگر افراط زر کی وجہ سے ان کی قوت خرید میں کوئی فرق نہیں پڑا تو اس صورت میں ضروری ہوتا ہے کہ ان کی ادائیگی ٹھیک اسی تعداد میں کی جائے، اور اگر افراط زر کی وجہ سے ان کی قوت خرید کچھ کم ہو گئی ہے جس کے جاننے اور متعین کرنے کا مسلمہ معیار سونا ہے تو اس کے مطابق نوٹوں کی ادائیگی کچھ زیادہ تعداد میں بھی ہو سکتی ہے تا کہ ہر فریق معاملہ کو اس کا پورا حق ملے اور معاملہ عدل کے مطابق طے ہو۔

معاملہ قرض میں انفلیشن کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسئلہ کا جو حصول میں نے لکھا ہے وہ دو اور دو چار کی طرح واضح ہونے کے ساتھ اصول شریعت اور منشاو مقاصد شریعت کے عین مطابق ہے۔ بحمد اللہ تقریباً پچاس سال سے بحر شریعت میں غواصی میرا محبوب مشغلہ ہے، لہٰذا میں تحدیث نعمت کے طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت سے دین کا وہ علم و فہم عطا فرمایا ہے جو بہت کم کسی کو نصیب ہے۔ لہٰذا اس تنقید نگار کا آگے یہ لکھنا کہ "مولانا کی رائے دو اعتبارات سے منشاء شریعت کے خلاف ہے" چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے جو اس کو زیب نہیں دیتی جو علم و فہم کے لحاظ سے ابھی بہت پس ماندہ اور کم مایہ ہے۔ اس کی تحریر کا علمی تجزیہ کر کے اس سے پہلے جو میں لکھ چکا ہوں پڑھنے والوں کو اس سے موصوف کے علم و فہم کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ آگے دو اعتبارات کی وضاحت میں جو لکھا ہے وہ بھی سطحی معلومات اور الجھے ہوئے ذہن کی غمازی کرتا ہے، دعوے اور دلیل میں کوئی ربط اور مطابقت نہیں۔

آخر میں میری تحریر کے آخری پیراگراف پر جو اعتراض کیا گیا ہے اس کا جواب یہ کہ میں نے اس پیراگراف میں یہ جو لکھا ہے کہ "افراط زر کے حوالے سے جو باتیں پڑھنے سننے میں آئی ہیں ان میں ایک نہایت غلط اور گمراہ کن بات یہ ہے کہ چونکہ اس سے کرنسی

© rasailojaraid.com

نوٹوں کی قوت خرید میں کمی واقع ہوتی ہے لہٰذا کرنسی نوٹوں کی شکل میں بینک کو دیئے گئے سودی قرضہ پر بینک سے سود لینا جائز ہے"۔ اس بات کو غلط اور گمراہ کن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بینک سودی قرضوں پر فیصد کے لحاظ سے جو شرح سود مقرر کرتا ہے اس میں کبھی انفلیشن کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ انفلیشن ہو یا نہ ہو ہر حال میں وہ مقررہ شرح کے مطابق سود دیتا اور لیتا ہے۔ اسی طرح جو کھاتہ دار بینک میں سودی کھاتہ کھولتا ہے اس کا مقصد مقررہ شرح کے مطابق بینک سے سود لینا ہوتا ہے' اس کے ذہن میں بھی انفلیشن کا کوئی خیال نہیں ہوتا' کیونکہ انفلیشن ہر حال میں کوئی لازمی چیز نہیں' یہ بعض طرح کے حالات میں ہوتا ہے ہمیشہ نہیں ہوتا' لہٰذا کبھی ہو جانے والے انفلیشن کی بنا پر بینک کے سود کو جائز قرار دینا جبکہ بینک کے سود کی شرح اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جتنی انفلیشن سے قرض کے مال میں کمی واقع ہوتی ہے بینکوں کے سودی نظام کو قائم رکھنے کے لئے سہارا مہیا کرنا ہے جو کسی طرح جائز نہیں' لہٰذا میں اس کی حمایت کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ میری تمام تر بحث و تمحیص کا تعلق قرض حسن کے اس معاملہ سے ہے جو دو مسلمانوں کے مابین کرنسی نوٹوں کے ذریعے طے پایا ہو اور پھر افراط زر کے زیر اثر لئے گئے اور واپسی میں دیئے جانے والے نوٹوں کی قوت خرید میں فرق پیدا ہو گیا ہو' سودی قرض کے اس معاملہ سے نہیں جو بینک اور اس کے کھاتہ داروں کے مابین طے پاتا ہے اور جو از روئے اسلام قطعی طور پر حرام ہے اور چونکہ قرآن مجید کی آیت "اِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسِ اَمْوَالِکُمْ" میں سود خوروں کے لئے اصل مال کی واپسی توبہ کے ساتھ مشروط ہے لہٰذا جو مسلمان اس سے تائب ہو کر ہمیشہ کے لئے اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں ان کے لئے اصل کی واپسی بھی ضروری نہیں رہتی کیونکہ شرط کے انتفاء سے مشروط کا انتفاء ہو جاتا ہے۔ البتہ قرضہ حسنہ میں اصل کی واپسی ہر حال اور ہر صورت میں لازمی ہوتی ہے اور مقروض پر واجب ہوتا ہے کہ وہ انفلیشن کے ذریعے پیدا ہونے والے نقصان کو برداشت اور اس کی تلافی کرے' اگرچہ قرض خواہ کے لئے یہی بہتر ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر کہ اگر قرض پر دیئے ہوئے کرنسی نوٹ اس کے پاس موجود ہوتے تو اس صورت میں بھی افراط زر کی وجہ سے ان کی قوت خرید میں ضرور کمی واقع

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

ہوتی ہے مقروض سے اس کمی کا عوض وصول نہ کرے' لیکن مقروض کو بہرحال اس کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے کہ قرض خواہ کو قرض کی واپسی اس طرح ہو کہ اس کو اس کا حق پورا پورا ملے جو شریعت اسلامی نے اس کے لئے مقرر کیا ہے' یعنی دیئے ہوئے مال کے بدلے برابر مال اور اس کی مثل جس کی تفصیل پہلے مکرر بیان ہو چکی ہے۔

ایک قابل غور مسئلہ

آخر میں کرنسی نوٹوں کے ذریعے زکوٰۃ کی ادائیگی کے حوالے سے ایک مسئلہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے زیر بحث مسئلہ سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ امید کہ وہ اہل علم حضرات جو مجھ سے زیر بحث مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں اس مسئلہ پر ضرور غور فرمائیں گے!

مسئلہ اس طرح ہے کہ آج سے دس سال پہلے ایک مسلمان تاجر کی ملکیت میں ایک لاکھ روپے کا سامان تجارت تھا۔ سال گزرنے کے بعد سونے چاندی کی زکوٰۃ کے حساب سے اس پر اڑھائی ہزار روپے زکوٰۃ واجب ہوئی لیکن وہ کسی وجہ سے اس وقت ادا نہ کر سکا۔ اب دس سال کے بعد کرنا چاہتا ہے تو کیسے ادا کرے۔ اگر آج کے ڈھائی ہزار کے کرنسی نوٹوں سے ادا کرتا ہے تو وہ آج کے ایک لاکھ کے سامان تجارت کی زکوٰۃ تو ہو سکتی ہے لیکن دس سال پہلے کے ایک لاکھ کے عروض تجارت کی زکوٰۃ نہیں ہو سکتی' کیونکہ اگر آج وہ موجود ہوتا تو اس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ ضرور ہوتی اور اس پر اڑھائی ہزار کی بجائے پونے چار ہزار روپے زکوٰۃ واجب ہوتی۔ دوسری وجہ یہ کہ اس سے مستحقینِ زکوٰۃ مساکین وغیرہ کو ان کا پورا حق نہیں ملتا اور نقصان پہنچتا ہے۔ وہ اس طرح کہ آج کے اڑھائی ہزار کے کرنسی نوٹ قوت خرید میں دس سال پہلے کے اڑھائی ہزار کے کرنسی نوٹوں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ دس سال پہلے کے اڑھائی ہزار روپے کے عوض جس مقدار میں اشیاء ضرورت دستیاب ہوتی تھیں آج کے ڈھائی ہزار کے عوض ان سے آدھی مقدار میں بھی حاصل نہیں ہو سکتیں' تو پھر اس مسئلے کا ایسا حل کیا ہو سکتا ہے جس سے زکوٰۃ کی ادائیگی بھی شریعت کے مطابق ہو اور مستحقین زکوٰۃ کو بھی ان کا حق پورا پورا اور ٹھیک ملے۔

© rasailojaraid.com